پروفیسر ممتاز حسین اور تہذیب و ثقافت کے مباحث

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل[1]م محمد ناصر آفریدی[**]

Abstract:

"Professor MumtazHussain is a renowned writer and critic of Urdu literature, associated with the Progressive Writers Movement. The present study is focussed on his critical works regarding culture and civilization, as depicted in Urdu literature, in the context of the Progressive Criticism rooted in the Marxist Theory of Materialism. The human society has been divided into two classes on the economic dichotomy. The Proletariat class is deprived of the basic rights and standards of human dignity. The working class constitutes a marginalized section of the society, having a distinct culture which is an outcome of the oppressive attitude of the rich class. The British Colonialism also contributed to strengthen the discriminatory system based on economic conditions. Only "Sufis" tried to preach universal love and brotherhood. Professor MumtazHussain suggests that a healthy society is possible only by following the Progressive Movement and the Marxist ideology. The Progressive writers give prime importance to common men, village folk, and working class. They present the oppressed section of society in heroic terms. The deprived people constitute their literary themes and the solution to their problems are discovered in the Marxist theory of literature, Professor Mumtaz Hussain has a clear object in his mind while making his contribution as a literary critic. He stands against the Conservatism, Fascism, Colonialism, Imperialism, Modernism, Dictatorship and every undemocratic rule over the people. For him, the real substance of society is common people then who knit the fabric of culture. Unfortunately, the power sector of society never pays attention to these down-trodden people. The limited class dictates the "majority" of society. The voice of the majority is lost under the impact of dictatorial tone of the few. Therefore, it is necessary to give proper and due place to these neglected people in literature through an organised movement, what the progressive writers and critics do."

کلیدی الفاظ: ادب، روایت اور کلچر،ادبی مسائل،اردو زبان و ادب، مشترکہ کلچر،ترقی پسند تنقید، انسان، انسانی سماج، طبقاتی نظام، مارکس، مارکسی فکر،مارکسی تنقید، بورژوا، پرولتاری، شعر و ادب، تہذیب و ثقافت، پروفیسر ممتاز حسین، ادب، شعور اور زندگی

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے نہایت اہم اور وسیع المطالعہ ناقدین میں پروفیسر ممتاز حسین سربر آوردہ نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا انتقادی سرمایہ لایقِ تحسین ہے۔ ان کے تنقیدی مجموعوں میں نقدِ حیات (۱۹۵۰ء)، ادبی مسائل (۱۹۵۴ء)، نئی قدریں (۱۹۵۵ء)، نئے تنقیدی گوشے (۱۹۵۷ء)، انتخابِ کلامِ غالب مع مقدمہ (۱۹۵۷ء)، باغ و بہار (میرا من) مع مقدمہ و فرہنگ (۱۹۵۷ء)، ادب اور شعور (۱۹۵۹ء) غالب ایک مطالعہ (۱۹۶۹ء)، امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری (۷۶-۱۹۷۵ء)، نقدِ حرف (۱۹۸۵ء)، حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن،ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، لوئر مال کیمپس، لاہور
[**] پی ایچ۔ڈی سکالر، سرحد یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی،پشاور

مطالعہ (۱۹۸۸ء)، ادب اور روحِ عصر (۲۰۰۳ء) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ترقی پسند نظریات کا بنیادی موضوع طبقاتی سماج میں بورژوا اور پرولتاری(Proletariat) ؛ طبقہ عوام؛ مزدور پیشہ طبقہ؛ آبادی کا وہ حصہ جو اپنے گزارے کے لیے روزانہ یا عارضی روزگار پر انحصار کرتا ہے؛ محنت کش طبقہ یا عام طور پر اُجرت کمانے والے؛ مزدور لوگ اور اوّل الذکر طبقہ جس میں سرمایہ دار اور جاگیر دار شامل ہیں جو ساری دنیا کے وسائل اور ذرائع پیداوار پر قابض ہیں۔ ترقی پسند تنقید کا بنیادی حوالہ مصائب و مسائل کے بوجھ تلے دبایا گیا انسان ہے جو اقتصادی اعتبار سے مفلوک الحال، پسماندہ، غربت زدہ اور حاشیے پر موجود انسان ہے، ترقی پسند ادب و انتقاد نے اسی انسان کو اپنی آئیڈیالوجی کے ذریعے موضوع بنانے کی سعی کی ہے۔ کائنات کے بہت سارے معاملات و مسائل انسان ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ مادی دنیا میں پرولتاری طبقے کے انسان سے متعلقہ سوالات ہی پروفیسر ممتاز حسین کے تنقیدی نظام کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ترقی پسند ناقدین میں پروفیسر ممتاز حسین نے سویلزیشن(تہذیب) اور کلچر(ثقافت) کے مباحث میں بھی' انسان مرکز' کائنات پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے نزدیک سویلزیشن (تہذیب، جس کا اظہار خارجی مظاہر کی ٹھوس شکل میں ہوتا ہے)، کامادّی دنیا کے جملہ اُمور و معاملات سے تعلق اور کلچر کا داخلی یا باطنی انسانی فکر و نظر سے انسلاک ہے۔ خارجی زندگی ہو یا داخلی دونوں کا تعلق انسان سے ہے۔ انسان نے صدیوں کا تہذیبی و ثقافتی اور تاریخی سفر طے کیا ہے اور زمانے کے کئی تغیرات اس کو ورطۂ حیرت میں بھی مبتلا کرتے رہے ہیں مگر انسانی تہذیب اور ثقافت کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم پڑتا ہے کہ ایک طبقہ، جسے کارل مارکس نے بورژوا کا نام دیا، اس کی بالادستی دوسرے پر قائم رہی ہے۔ کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت کا نظریہ انسانوں کے ہی معاشی اور اقتصادی موضوع پر دلالت کرتا ہے اور 'مادّے کی شعور پر بالادستی' کا فلسفہ مارکس ہی کی دین ہے۔کارل مارکس کے نزدیک شعور درحقیقت مادے ہی کی پیداوار ہے۔ مارکس نے سماجی سطح پر ہیگل کے فلسفے کی ماورائی و مابعد الطبیعیاتی تعبیرات کو منقلب کرکے، اُن تعبیرات کا اطلاق انسانی صورتِ حال یا مادّی دنیا پر کیا اور یہ فلسفہ قایم کیا کہ مادّہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے اور آزادانہ طور پر اپنا الگ سے اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ مادّے کے اثرات کے نتیجے میں ذہنی و فکری سطح پر جدلیاتی صورتِ حال جنم لیتی ہے۔ اس طرح مادّہ تسلسل کے ساتھ ذہن و فکر اور انسانی شعور کو متاثر کرنے کا فریضہ سر انجام دیتا رہتا ہے۔ مذکورہ فلسفے کا اطلاق ترقی پسند نقادوں نے معاشی نظام، اقتصادی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ شعر و ادب اور دیگر فنون پر بھی کیا۔اِس طرح مذکورہ آئیڈیالوجی سے شعر و ادب اور فکر و فن بھی متاثر ہوتے ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین نے اسی نقطۂ نظر سے انسانی تہذیب و ثقافت اور اس کے دیگر معاملات اور طرزِ احساس کا اپنی تنقیدمیں مارکسی فکر کے زیرِ اثر تجزیہ اور محاکمہ کیا ہے۔ انھوں نے انسان اور مادّی دنیا کے مسائل و معاملات کو شعر و ادب کے سیاق و تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین کے تنقیدی نظام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اقتصادی نظام دراصل تہذیبی و ثقافتی صورتِ حال، سماجی معاملاتِ زندگی اور انسانی شعورکو بالیدگی عطا کرنے کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔وہ شعور ہی کی جھلکیاں سماجی زندگی میں افراد کے نظام فکر اور شعر و انتقاد کی شکل میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک شعور کا تعین اقتصادی صورتِ حال اور سماجی زندگی ہی کرتی ہے اور پھر انسانی شعور، فہم و ادراک مذکورہ صورتِ حال سے متاثر ہو کر انسانی زندگی پر بھی اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے:

> "شعور،زندگی کا ایک ایسا مظہر ہے جو زندگی سے متعین بھی ہوتا ہے، لیکن زندگی سے ممیز ہوکر زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ شعور اور زندگی دونوں مل کر ہی زندگی کی وحدت بناتے ہیں۔ تصادم اور کش مکش ایک قانونِ ارتقا ہے۔ زندگی کا ہر مظہر اس قانون کے تابع ہے۔ اسی سے تغیّر، تبدیلی اور انقلاب ہے۔"[1]

شعور ہی کا کمال ہے کہ معاشرتی زندگی میں کلچر کا نظام، تغیرات سے آشنا ہوتا رہتا ہے،شعور اور زندگی کے باہم آمیز ہونے سے ہی مقصدی ادب تخلیق ہوتا ہے اور ادب سے ہی

جمالیات کا نظامِ اقدار بھی جنم لیتا ہے۔ نظامِ اقدار اسی وجہ سے تبدیلی سے بھی آشنا ہوتا رہتا ہے۔ افکار و تصورات، آدرش اور نظریات شعور کی کارفرمائی سے ہی بدلتے رہتے ہیں۔ پرانی اقدار کی جگہ نئی اقدار اور نیا فلسفۂ زیست لے لیتا ہیں۔شعور اور انسانی حیات کا تعلق درحقیقت کلچر اور سوسائٹی سے ہے۔ اسی لیے شعور ارتقا کی منازل طے کرتا رہتا ہے۔ اس میں اکتساب کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ پسند و ناپسند، ردو قبول اور انقلاب و تغیرات ہوتے رہتے ہیں مگر انسانی شعور، کلچر کے تابع رہنے کی کوشش بھی جاری رکھتا ہے۔ اس طرح ادبی شعور، سماجی زندگی کی تمام جہات کا احاطہ اور تجزیہ کرتا ہے۔ادب کا بنیادی موضوع انسان اور اس سے جُڑے ہوئے تمام رشتے ہیں۔ ادب چوں کہ کلچر کی پیداوار ہے، اس لیے ادب کا موضوع انسان، اشیا اور کائنات کے باہمی رشتے ہیں۔ ادبی شعور ہی ادب کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ ادبی شعور یہ بتاتا ہے کہ ادب، موضوع کی ٹریٹ منٹ اور معنی کے رشتوں کے پیچھے جو تصورات کام کررہے ہوتے ہیں۔ وہ ہی معنی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ شعور ہی ادبی تجربے کے پیچھے کام کررہا ہوتا ہے۔زندگی کے شعور کے اظہار کے لیے تخیل کی کارفرمائی بھی بڑی معنی خیز ہے۔ انسانی حافظے کے پیچھے ثقافت اور سماج کی کارفرمائی بھی یقینی ہوتی ہے، شعور دراصل حواس، ادراک اور عقل سے کام لیتاہے۔ اس طرح تخیّل اور تعقل دونوں کے باہمی امتزاج سے تعمیری اور بامعنی ادب پیدا ہوتا ہے۔کارل مارکس کے نزدیک ضرورت اُس وقت تک نابینا رہتی ہے جب تک کہ وہ شعور کا حصہ نہ بن جائے اور ضرورت کے شعور کا حصہ بننے کے لیے آزادی ناگزیر ہے۔[2]

پروفیسر ممتاز حسین کے نظریۂ تنقید میں شعور اور مادہ کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ 'کلچر ا ور فرقہ پرستی' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> "جب تک ایک نیا نظام اپنی ترقی پسند قدروں کی نگہبانی کرتا رہا ہے اور اپنی آزاد قُوتوں پر نفس پرست بادشاہوں، امیروں اور جاگیرداروں کو قابض نہیں ہونے دیا ہے۔ اس وقت تک کلچر کے محرکات انسانی فطرت کی تعمیر میں حصّہ لیتے رہے ہیں، لیکن جب بھی زردار طبقوں کی رجعت پسند طاقت نے ان قوتوں کو اپنے ذاتی مفاد میں ڈھال لیا ہے تو کلچر نے بھی ہتھیار ڈال دیے ہیں، پھر ایک زوال پسند اور رجعت پسند نظام کے لیے ایک رجعت پرست فطرت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وہ سبب ہے کہ رجعت پرست طبقے علم و عقل کی مخالفت کرتے ہیں اور انسانی فطرت میں قدیم تعصبات کو اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فسطائیت سرمایہ داری کا ایک خارجی مظہر تھا، لیکن فسطائیت کو یہ معلوم تھا کہ فسطائی نظام کے لیے فسطائی درندوں کی بھی ضرورت ہے، چناں چہ اسی ضرورت کے ماتحت ہٹلر نے تعلیم اور انسانی ضمیر کی مخالفت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔'ضمیر انسان کا صرف وہم ہے۔ تعلیم اور ضمیر انسانوں کو مفلوج کردیتے ہیں۔ مجھے یہ برتری حاصل ہے کہ میں اس قسم کے وہم سے بالکل آزاد ہوں'یہ کچھ فاشزم کے لیے صحیح ہے بلکہ تاریخ کے ہر رجعت پرست طبقے نے انسانی فطرت میں بہیمانہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔"[3]

پاپولر کلچر کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اشرافیہ کی جکڑ بندی سے آزاد رہے جب کہ ہر دور کی فسطائی قوتیں پرولتاریہ کے آزادیِ اظہارِ رائے پر پابندیاں عائد کرتی رہی ہیں۔پروفیسر ممتاز حسین نے کلچر کی اصطلاح کو انسانی ذہن و فکر کے سیاق و تناظر میں رکھ کر تجزیے کیے ہیں جب کہ کچھ نقادوں نے تہذیب و ثقافت کو ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے اور اِس کے لیے وہ 'تہذیب' کی اصطلاح کو عموماً تہذیب و ثقافت کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیکن مذکورہ اصطلاحات کے مابین واضح امتیاز قائم کرنا وقت کی ضرورت ہے تاکہ خلط مبحث سے اجتناب کی کوئی صورت نکل سکے۔کلچر(ثقافت) میں عام طور پر کسی ملک یاقوم کے نظامِ اقدار میں سماجی سطح پر فکری تغیر و تبدل سے عاری قدروں کی نمایندہ ہوتی ہیں اور یہ داخلی خصوصیات مثلاً معتقدات اور رسم و رواج وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہیں جب کہ 'تہذیب' اُن اقدار پر عمل کرنے کے ذرائع کی نمایندہ اور ترجمان ہے، جو تغیر و تبدل سے بھرپور ہوتے ہیں اور یہ خارجی عناصر و عوامل مثلاً ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں، جن میں مرورِ ایّام کے ساتھ 'موڈی فیکیشن' بھی کی جا سکتی ہے لیکن جو

ادیب تہذیب کی اصطلاح تہذیب و ثقافت کے لیے مجموعی اعتبار سے استعمال کرتے ہیں، اُن کے نزدیک اِس کا ایک پہلو مادیت پر مشتمل ہے جو تہذیب کی عکاسی کرتا ہے جب کہ دوسرا پہلو غیر مادی ہے جو(کلچر) ثقافت کاطرف دار ہے۔اِس طرح ادب کا تعلق انسانی شعور، تاریخ، تہذیبی ارتقا، معیشت اور انسانی زندگی کی ترجمانی کی متعدد جہات اور پہلوؤں کے ساتھ اپنا انسلاک کرتا ہے جو ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کے نظامِ انتقاد میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔اِسی ترقی پسندانہ رجحان کی مناسبت سے پروفیسر احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون'ادب اور تہذیب'میں تہذیب پر احسن انداز سے روشنی ڈالی ہے:

> "ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں یہ جانتا ہے کہ تہذیب ایک ملک کے فنون لطیفہ، ادب، فلسفیانہ خیالات، طرزِ معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوش گوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ طبقاتی سماج میں مختلف طبقوں کے لیے اِس کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے، لیکن کسی نہ کسی قسم کی تہذیبی زندگی کا وجود، طریقِ پیداوار پر قدرت رکھنے کی مناسبت سے لازمی ہے۔ تہذیب کیا ہے؟ جب ہم لفظ تہذیب استعمال کرتے ہیں تو اِس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اُس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ انسان قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے وہ تہذیب اُس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتارِ ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب، قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کر لیتی ہے، اُس کو بناتی سنوارتی ہے، اُسے ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ وہ اِن ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اُسے عطا کی ہیں۔ اِس طرح تہذیب ایک قوم کے شعور کا مظہر بن جاتی ہے لیکن اِس کی سطح کبھی یکساں نہیں ہوتی کیوں کہ تہذیبی اقدار یکساں طور پر ہر طبقے کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب تہذیبی ارتقا کا ایک جزو اور اُس کا ترجمان بن کر زندگی کی اِس کشمکش کو پیش کرتا ہے جو کبھی فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں رونما ہوتی ہے، کبھی جماعت اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں اور ادب اُس اظہار میں جس قدر زیادہ عمومی انداز اختیار کرتا یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی کا ترجمان بنتا ہے، اُسی قدر وہ تہذیب کے عمومی پہلو ؤں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔"(4)

پروفیسر احتشام حسین'تہذیب' کی اصطلاح کو داخلی اور خارجی زندگی کے تمام شعبوں کے سیاق و تناظر میں استعمال کرتے ہیں۔اس طرح 'تہذیب' کی اصطلاح کے مفاہیم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور مذکورہ اصطلاح پھیل کر اپنے دامن میں اتنی وسعت پیدا کر لیتی ہے کہ'کلچر' کی اصطلاح کو بھی اپنے دامن میں سمو لیتی ہے۔وہ عناصر و عوامل جن سے کسی بھی قوم کی نظریاتی، جذباتی یا نفسیاتی سطح پر وابستگی ہوتی ہے، اُنھیں وہ قوم عزیز رکھتی ہے۔دراصل انسانی ذہن و فکر کے نتیجے میں ہی 'تہذیب' اور'کلچر'اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہیں۔کلچر کا اظہار داخلی یا فکری سطح پر ہوتا ہے جب کہ 'تہذیب' کا اظہار خارجی یا ٹھوس شکل میں ہوتا ہے۔یہ امر تو طے شدہ ہے کہ 'تہذیبوں' کا سفر تو ہزاروں سال پر محیط ہوتا ہے جس کے ساتھ اقوام کی سماجی، بشریاتی، اقتصادی، جغرافیائی اور تاریخی صورتِ حال بھی جُڑی ہوتی ہے۔کلچر ایک ایسی وسیع اصطلاح ہے جس میں ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو مرکزی مقام کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔

تہذیب دنیا کے کسی بھی خطے کی ہو،اُس کے اجزا لوگوں کی زندگیوں پر کئی طرح سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کے خیال میں ہر عہد اپنے تہذیبی ماحول کا خود ذمہ دار ہوتا ہے جس میں معاشرتی، فکری، مذہبی اور مابعدالطبیعیاتی روایات بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اِن کے ساتھ علوم و فنون،ادبیات اور زندگی کے مختلف طریقے کسی بھی مخصوص عہد کی تصویر

کشی کرتے ہیں۔ یہی وہ مزاج ہوتا ہے جس کی بنا پر لوگ اپنا ظاہر اور باطن تشکیل دیتے ہوئے اپنی تہذیب کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر شمیم حنفی کی رائے ملاحظہ ہو:

"کسی بھی تہذیب کے اجزا اور اُس کے ابعاد کی تعبیر، ایک ساتھ کئی سطحوں پر کی جا سکتی ہے۔ ہر عہد کی معاشرتی روایت، فکری روایت، مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی روایت کی آمیزش اور انضمام سے اُس عہد کے تہذیبی تناظر کی بنیادیں تیار ہوتی ہیں۔ علوم اوور ادبیات اور فنونِ لطیفہ اور اسالیبِ زندگی کے ملے جلے عناصر سے کسی عہد کے مجموعی مزاج کی تصویر بنتی ہے۔ اِسی مزاج کی روشنی میں، ہم اپنے زمان و مکان کی بساط پر بکھرے ہوئے بیرونی اور باطنی منظر نامے کا مشاہدہ کرتے ہیں او ر تہذیب کے بارے میں اپنے تناظر کی تشکیل کرتے ہیں۔"(5)

ثقافتی مطالعہ مختلف علوم کی پریکٹسز کا سیٹ ہے۔Wilfred L. Guerinکے مطابق:

"ثقافتی مطالعہ ایک کثیر الشعبہ جاتی علم ہے جو مارکسزم، نو تاریخیت، تانیثیت، اصنافی مطالعہ، علمِ بشریات، مطالعہ نسلیت، نظریۂ فلم، سماجیات، مطالعہ شہریت، مطالعہ پبلک پالیسی، مطالعہ پاپولر کلچر اور مابعد نوآبادیاتی مطالعات جیسے علوم کے اُن عناصر سے ظہور پذیر ہواجن کا زور ایسی سماجی اور ثقافتی قوتوں پر ہے جو کمیونٹی بناتی ہیں، اُسے تقسیم کرتی ہیں یا پھر اُن میں بے گانگی پیدا کرتی ہیں۔"(6)

پروفیسر ممتاز حسین نے وسیع تر عالمی تناظر میں طبقاتی تقسیم بورژوا اور پرولتاری سماج میں کلچر کی انحطاط پذیری اورعروج و زوال کا جائزہ لیاہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بورژوا کلاس طاقت و اقتدار کا استعمال کر کے پرولتاری سماج کے کلچر کو بھی پسماندہ رکھتی ہے۔ اس طرح کی صورتیں انسانی معاشروں کی تاریخ میں موجود رہی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رجعت پرست طبقات علم و عقل کی اس لیے مخالفت کرتے ہیں تاکہ پرولتاری طبقے کو پسماندگی کی طرف دھکیلا جاسکے۔ ان کے نزدیک بورژوا، سرمایہ دار اپنے وسیع تر مفادات میں پرولتاری کلاس کے کلچر کے وہ محرکات کی جو انسانی تعمیر و ترقی اور ارتقا میں کارفرما ہوتے ہیں، ان میں پرانے تعصبات کی آگ کو تیز تر کرکے ایک آئیڈیالوجی کو بروئے کار لاتے ہوئے پسماندگی اور ماقبل تاریخ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہر دور میں فسطائیت کی شکل میں موجود رہی ہے۔ ہٹلر بھی اسی فسطائیت کا نمایندہ تھا جس نے اخلاقی اقدار کی مخالفت کی تھی۔ اس نے پاپولر کلچر کی آزادی کو بھی پسِ پشت رکھا۔ بہیمانہ سماج کے رجعتی اور فاشسٹ افرادکے لیے اس طرح کے نظریات موزوں ترین ہیں۔ اس طرح سے پرولتاری کلچر کو ترفع کی طرف جانے سے بازاور ممنوع رکھا جاتا ہے اور اس کے شعور کی طاقت کو بھی دبایا جاتا ہے۔ پروفیسرممتاز حسین نے کلچر اور سوسائٹی کے عروج و زوال کا ترقی پسند جدلیات کے تناظر میں تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے کلچر کیا ہے؟ کے مباحث سے اُوپر اُٹھ کر کلچر کی ترقی اور تنزلی کے اسباب و محرکات کا جائزہ لیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اسلام اور قبل اسلام کے کلچر کے عروج و زوال کی کہانی کا ترقی پسند جدلیاتی استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے محاکمہ کیا ہے۔ انھوں نے بنو عباسیہ کے زمانے میں کلچر کی ترقی اور اس عہد کی سماجی ترقی کو اسلام کے اعتقادات کی ترقی پسندانہ کاوشونکا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اگرچہ بنوعباسیہ کا عہد ملوکیت کا تھا، باوجود اس کے اس دور میں اخلاقی اقدار آگے بڑھتی ہیں۔ جب کہ معتصم باللہ نے احیائے مذہب کے پردے میں تمام علوم و فنون کی ترقی کی مخالفت کی۔ اس طرح اس عہد کا سماج اور کلچر تنزلی کا شکار ہُوا۔متصم باللہ سے بہت پہلے معتزلہ اور اشعریہ کی کشمکش اور آویزش بھی اُس دور کی تاریخ کا حصہ ہے۔بنو عباسیہ کے زوال کے ساتھ ہی ا س سماج میں کلچر کا زوال شروع ہوا۔تاریخ اور معاشروں کے عروج و زوال کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین غیر منقسم ہندوستان کی طرف مراجعت کرتے ہوئے برہمن سماج کے تنزل کے بعد اشوک کے دور میں کلچر کے ارتفاع کا رُخ کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی سماجی زندگی میں اشوک کے زمانے کو سماج اور کلچر کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین نے عربوں کے سماجی معاملات، عروج و زوال اور کلچر کی صورتِ حال حوالۂ قلم کرنے کے ساتھ ساتھ

غیر منقسم ہندوستان میں آریاؤں کی قدیم معاشرت اور اُن کے برصغیرکے قدیم مقامی باشندوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا بھی محاکمہ کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"ابتدائی ویدک تہذیب میں خواہ مجرد فلسفے نے کتنی ہی ترقی کرلی ہو، لیکن معاشی زندگی میں برہمنوں اور پروہتوں کے طبقے نے ایسی خرابیاں پیدا کردی تھیں کہ بالآخر گوتم بدھ کو تمام مابعدالطبیعیاتی مسائل سے منہ موڑ کر سماجی سدھار کا بیڑا اُٹھانا ہی پڑا اور اگر ماضی کے اس دُھندلکے میں کوئی زریں دور نظر آتا ہے تو وہ صرف اشوک کا زمانہ ہے۔ میں اس زمانہ کو کلچر کی ترقی کا بھی زمانہ سمجھتا ہوں کیوں کہ بدھ دھرم کی تحریک نے ایک ایسے انسانی تصور کو جنم دیا جو ذات پات کے بندھنوں سے آزاد تھا جس نے مابعد الطبیعیاتی مسائل کے مقابلے میں معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں زیادہ سرگرمی سے کام لیا جس نے روحانی اذیت کے ساتھ انسانی اذیت کو بھی انسانیت کے لیے منفی بتایا۔"(7)

ایک طرف تو وہ برہمنوں کے امتیازی برتاؤ کو سماج اور کلچر کی تنزلی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف اشوک کی سماجی زندگی کے ساتھ جڑت اور سماجی فلاح کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اشوک کے دور کو وہ سماج اور کلچر کی ترقی کا زمانہ قرار دیتے ہیں، جس دور میں کلچر کے تمام اجزائے ترکیبی میں ترقی وارتقا نظر آتا ہے۔ بالخصوص پرولتاریہ کی معاشی حالت اور معاشرتی زندگی میں پہلے سے بہتری کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔پروفیسر ممتاز حسین نے اشوک کے دور کو تہذیب و ثقافت کی ترقی اور ارتقا کا زمانہ اس لیے بھی قرار دیا کہ اس دور میں نہ صرف عا م لوگوں کی معاشی و اقتصادی حالت پہلے سے بہتر ہوئی بلکہ اس دور میں ذات پات کی تفریق کے نظام پر بھی کاری ضرب لگائی گئی۔ اس دور میں بدھ مذہبی کتابیں پرولتاری طبقے کی زبان میں لکھی گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ پالی زبان کو بھی ترقی دی گئی اور اسے اُس دور کی سرکاری زبان بنادیا گیا۔ اس کے برعکس برہمن یا پروہت جن کی زبان سنسکرت تھی۔ وید، مثلاً رگ وید، یجر وید، سام وید، اتھر وید وغیرہ مذہبی کتابیں اسی سنسکرت میں لکھی گئی تھیں اور یہ زبان اشرافیہ، مقتدرہ یا برہمن اور پروہت طبقے تک محدود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کا کلچر ایک محدود طبقے یعنی پروہت تک ہی محصور رہا تھا۔ اس طرح کلچر کا دائرہ عوام تک نہیں پہنچا تھا، لہٰذا اسے سنسکرتی یا کلچر کہنا موزوں نہیں ہے۔ کلچر پورے سماج کی نمایندگی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ اعلیٰ کلچر اس عہد کا ہوتا ہے جس عہد میں سوسائٹی کے کلچر کے تمام شعبوں میں ترفع پیدا ہو۔ علوم و فنون ترقی و ارتقا کی منازل طے کریں اور اپنی معراج کی طرف سفر کریں۔جب ایک کلچر دوسرے کلچر پر یلغار کرتا ہے تو اس کی originality برقرار نہیں رہتی۔ اس میں آمیزش کے عمل سے تغیرات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ بدھ دھرم جس کا تعلق سماجی زندگی میں پاپولر کلچر سے تھا، جب اس پر برہمنوں نے ثقافتی یلغار کی تو اس کی ماہیت ہی بدل گئی۔ اس میں مابعد الطبیعیاتی عناصر داخل کردیے۔ اشوک کے زمانے میں پالی زبان کو عوام کی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ برہمنوں نے جب بدھ دھرم میں آمیزش کی تو اس دھرم کی کتابیں بھی سنسکرت زبان میں منتقل کردیں۔ اس طرح پروہت طبقے نے رجعت پرستانہ کاوشوں میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح اشوک کے دور کے بعد کی سوسائٹی کے کلچر کی جگہ برہمن اور پروہت کے کلچر نے لے لی۔ بدھ دھرم میں مساوات کی تعلیم عوامی زندگی میں شامل تھی۔ اس صورتِ حال کو یکسر تبدیل کرنے کے لیے ویدک دھرم نے بدھ دھرم میں ترمیمات کیں۔مقامی کلچرنے بھی برہمنیت ذہن و فکر کو متاثر کیا۔ اس سیاق و تناظر میں پروفیسرممتاز حسین لکھتے ہیں:

"برہمنوں نے شیوا اور وشنو جو دراوڑوں کے دیوتا تھے۔ انھیں اپنے نظام میں شامل کرکے ان کی پرستش شروع کردی۔ چوں کہ بدھ دھرم کا مہان فرقہ گوتم کو اوتاربنا کر پہلے سے پوجنے لگا تھا۔ اس لیے یہ حربہ پہلے سے زیادہ کارگر ثابت ہوا۔ اس کی دوسری کڑی یہ تھی کہ گپت سلطنت نے پروہتوں کے اثرات کو اپنی حکومت سے ختم کردیا۔ اس سے عوام کسی قدر مطمئن ہوگئے۔ چناں چہ اسی مصلحت بینی کے تحت برہمنوں نے ارتھ شاستر اوردھرم شاستر الگ الگ لکھے اور اس میں اس بات کوواضح کیا کہ یوں تو قانون کو مذہب کے ماتحت بننا ہی چاہیے، لیکن ایسے بھی قانون بنائے جاسکتے ہیں، جن کا تعلق صرف عقل کے ساتھ ہے۔ اس

کا تعلق ویدک دھرم اوربرہمنیت کی تجدید نے ایک بار ایسا سنبھالا کہ سنسکرت زبان کو دوبارہ اس ملک میں فروغ ہوا۔ رزمیہ، شاعری، ڈرامے، مصوری، بُت تراشی سب وجود میں آئے اور وہ آج تک فنون عالیہ کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن یہ احیائے تمدّن ایک طرف تو وقتی تھا اور دوسری طرف ایک محدود طبقے میں گھرکر رہ گیا۔"(8)

پروفیسر ممتاز حسین نے ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں اشوک کے بعد کے عہد میں ان محرکات کا جائزہ لیا ہے جن کے پیشِ نظر ایک کلچر کی مداخلت یا آمیزش سے دوسرے کلچر کی ماہیت تبدیل ہوتی ہے۔ بدھ دھرم کا تعلق سماجی زندگی اور مقامی ثقافتوں سے تھا۔ اس میں برہمن اور پروہت پہلے داخل ہوئے بعد میں'بدھ دھرم'پر ویدک دھرم کی بالادستی کے لیے کام کیا۔ ارتھ شاستر لکھے۔ بدھ دھرم کے ماننے والوں کو اپنی طرف مائل کیا۔ اس طرح رجعت پرست عناصر نے اپنی بالادستی کے لیے کام کیا۔ اس طرح بدھ دھرم کی مذہبی و دیگر کتابیں جو اس سے پیش تر'پالی'میں لکھی گئی تھیں۔ ان کو سنسکرت میں منتقل کیا۔ اس طرح'پالی'کی جگہ'سنسکرت'نے حاصل کرلی اور بدھ دھرم میں مابعد الطبیعیاتی عناصر داخل کردیے گئے۔ اشوک کے دور کی معاشرت اور اس معاشرت کے کلچر کی ہیئت ہی تبدیل کرکے رکھ دی گئی۔ماضی کے ثقافتی حربے کو اگر آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں انڈین میڈیا کے ذریعے انڈین ہندو کلچر'پاکستانی ذہن و فکر' کو کس طرح تبدیل کرنے کے لیے کام کررہا ہے۔ انڈین موسیقی، رقص، فلموں کے ذریعے انڈین کلچر کی پاکستانی ثقافتوں پر یلغار کی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان کے پاس فلم اور انیٹرٹینمنٹ کی سطح پر کوئی بڑا متبادل ثقافتی نظام جو تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرے موجود نہیں ہے۔ ماضی کی تاریخ اور ویدک سماج اور کلچر کے زوال کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ گُپت سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی سنسکرت کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔ دکن میں علاقائی زبانیں جو دراوڑی کلچر کی زبانیں تھیں، ان میں شاعری کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ وہیں شیو بھگتی اور وشنو بھگتی تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ویدک کلچر اور تہذیب و تمدن کی وحدت و یگانگت اور تباہی کے پیچھے کاہنوں کا ذہن و فکر کارفرما تھا۔ ویدک تہذیب و تمدن اور کلچر کی تباہی کے پیچھے ان کا اپنا طبقاتی سماجیاتی نظام تھا جس نے ذات پات کے نظام کو فروغ دے رکھا تھا۔ اس تضاد کی وجہ سے ایک دفعہ تو ویدک کلچر زوال پذیر ہوا اور اس کی عمارت ڈھے گئی۔ ایک اور محرک یہ تھا کہ سنسکرت کا،پاپولر کلچر یا پرولتاریہ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ سنسکرت تو برہمن اور پروہت طبقے تک محدود زبان تھی۔اگرسماجی و بشریاتی تاریخ کے سیاق میں دیکھا جائے تو اس طریق سے کلچر میں بھی عروج و زوال یا آمیزش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی طرح ماضی کی سماجی و بشریاتی، ثقافتی اور تاریخی صورتِ حال میں ذہنی و فکری سطح پر تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین کی تنقید کا مرکز و محور حاشیے پر موجود بھوکا، ننگا، مصائب و مسائل کا شکار،غربت و افلاس کا مارا ہوا، غیر مساوی اقتصادی تقسیم کے ہاتھوں تنگ انسان ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشی و اقتصادی حالات سماج پر اپنے دُور رس اثرات مرتب کرتے ہیں اور انھی اثرات کے پیشِ نظر سماج دو طبقات میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ایک وہ جسے کارل مارکس نے بورژوا اور دوسرے کو پرولتاری کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ بورژوا طبقے کی ہر سماج میں بالادستی اقتدار، 'سپرسٹرکچر' پر کنٹرول، معیشت اور ا قتصادیات پر قابض و متصرف ہونے کے سبب برقرار رہتی ہے، یہاں تک کہ مذہب پر بھی بورژوا آئیڈیالوجی کی بالادستی قائم ہوجاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمام فنونِ لطیفہ (آرٹ)، شعرو ادب اور زبان پر بھی بورژوا طبقہ کنٹرول حاصل کرلیتا ہے۔ اس طرح سماج کی ذہنی وفکری حالت پر اپنی بالادستی قائم کرلیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بورژوا طبقہ اقتدار، وسائل اور ذرائع پیداوار پر قابض ہوکر پرولتاری طبقے کا، تمام شعبوں میں استحصال کرتا رہتاہے، یہاں تک کہ رجعتی عناصر پرولتاری طبقے کو نئے فکر و فلسفہ اور علوم و فنون سے بھی محروم رکھتے ہیں اور ان کے کلچر پر بھی بورژواژی طبقہ قابو پا لیتا ہے اور پرولتاریہ کو اپنی خدمات کے لیے ایک محروم طبقے کے طور پر زندہ رکھتا

ہے۔پروفیسر ممتاز حسین کے پیشِ نظر پرولتاریہ کی سماجی صورتِ حال، بشریاتی تاریخ اور معاصر زندگی ہے جس میں اس سے روا رکھے جانے والے استحصالی رویے اور اُس کی وہ ثقافتی شناخت ہے، جسے مسخ کیا جاتا ہے یا پھر اشرافیہ کی تقلید پر جبر کے نتیجے میں مجبور اور پابند کیا جاتا ہے۔ انھوں نے پرولتاری کلچر کا تاریخ کے مختلف ادوار میں جائزہ لیا ہے،خاص طور سے مغربی نوآبادیاتی استعمارکار اور ہندوستان کے بورژوا طبقات بالخصوص سرمایہ دار، جاگیر داراور رجواڑوں نے ہندوستان کے عام انسانوں کا جس طرح استحصال کرکے ان کے کلچر کو بھی رجعت پسندانہ عناصر اور پسماندگی کی طرف دھکیلنے کے لیے منظم آئیڈیالوجی کوبروئے کار لاتے ہوئے کام کیا۔ ان کی فکر یا آئیڈیالوجی کا بنیادی موضوع پرولتاری ثقافتوں کا وہ انسان ہے جو انسانی بشریاتی تاریخ میں کئی محاذوں پراستحصال زدہ رہا ہے یا تاحال استحصالی صورتِ حال کا شکار ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں مشترکہ کلچر، جس کی روایات میں محبت،امن، مساوات اور لسانی اخوت رہی ہے، اس کی بھی عکاسی کی ہے۔ درحقیقت وہ اسی کلچر کو پرولتاری طبقے کا کلچر قرار دیتے ہیں جو منافرت سے آلودہ نہیں تھا، جس میں تعصبات نہیں تھے، جس میں اُردو کو عمومی و ادبی اظہار کی زبان کا درجہ حاصل تھا اور اُردو ہی رابطے کی اور پاپولر کلچر کی بھی زبان ہے، جس کو خواجہ میر درد جیسے صوفی شاعر نے بغیر کسی مذہب و مسلک اور تفریق و امتیاز کے اپنے ما فی الضمیر کی آواز کے لیے نہ صرف منتخب کیا بل کہ سماج میں محبت کا پیغام بھی پھیلایا،یہی وجہ ہے کہ پروفیسر ممتاز حسین صوفیانہ افکار جن میں امن، رواداری اور محبت کی بات ہو، اُس کو بھی سراہتے ہیں اور ہندی تصوف کو بھی لائقِ تحسین گردانتے ہیں کیوں کہ اس فکری دھارے میں بھائی چارے کا کلچر نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔اس کلچر کے نمایندہ شعرا اور اس کلچر کو کاری ضربیں لگانے والے پروہتوناور برہمنوں کے حوالے سے پروفیسر ممتاز حسین کا تجزیہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

> "یہ تحریک جب بارھویں اور تیرھویں صدی میں بہت آگے بڑھی تو مسلمان صوفیوں نے بھی اس کی آواز پر لبیک کہا۔ وحدت الوجود کا لسانی اخوت اور مساوات دونوں تصوف کی تحریکوں کا بنیادی ایمان تھا۔ اس ہندی تصوف نے ایک ایسا رُوپ دھار لیا کہ بالآخر کفر و ایمان کے جھگڑے مٹنے لگے۔ قلندر نے جوگی کا بھیس بدلا اور جوگی نے گیروا لباس زیبِ تن کیا۔ ہماری تہذیب کی یہی وہ مشترکہ اساس اور روایات رہی ہیں، جہاں ہمارا ادب سیراب ہوتا رہا۔ کبیر کی شاعری اسی تمدّن کا نچوڑ ہے۔ امیر خسرو نے اسی کلچر کی تعلیمات کو پھیلانے کی کوشش کی ہے اور نانک نے اسی کلچر کی وحدت کو اپنے گرنتھوں میں جگہ دی ہے۔"(9)

پنجاب میں بابا فرید، بلھے شاہ، شاہ حسین اور وارث شاہ جیسے شعرا نے اپنے اپنے صوفیانہ خیالات اور شاعری کے ذریعے سماج میں محبت اور امن و انسان دوستی کے کلچر کو فروغ دیا، سندھ اور بلوچستان کی سرزمین پر آباد صوفی شعرا مثلاً سچل سر مست اور خوشحال خاں خٹک نے بھی اپنے اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو جوڑنے کے پیغام کو عام کیا۔ پروفیسر ممتاز حسین انسان دوستی اور پرولتاریہ کے اس کلچر کے احیا کا نظریہ پیش کرتے ہیں جو غیر منقسم ہندوستان میں مشترکہ کلچر اور مشترکہ روایات، اقدار، اعلیٰ انسانی ضابطوں، اخلاقیات، فکر و فلسفہ اور تصوف کا امین تھا جس کی بنیادوں میں باہمی محبت، رواداری، بھائی چارے اور انسانی دوستی کی فضا قائم تھی۔ اس کلچر پر رجعت پسندوں، انگریز نو آبادیاتی استعماری ذہن و فکر اور مقامی بورژواژی طاقتوں نے مل کر ضرب کاری لگائی اور پرولتاری کلچر کو اُس کی شناخت سے اس لیے بھی محروم رکھا تاکہ بورژوا سماج کے مفادات کو زد نہ پڑ سکے۔ اگرچہ تصوف کی بہت سی اقدار اور روایات ترقی پسند اقدار اور نظریے کے خلاف ہیں مگر چند قدریں انسان دوستی کے حق میں بھی ہیں۔ اس لیے پروفیسر ممتاز حسین تصوف کے ہمہ اوست کے فلسفے کو جُزوی طور پر انسان دوستی کی روایات اور پرولتار ی کلچر کے حق میں بہتر خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہمہ اوست اور عشق کے نظریے نے ایشیائی ادب میں انسان دوستی کی روایات کی بنیادیں

ڈالی ہیں۔ ہم آج ان ادبی روایات کو اپناتے ہیں کیوں کہ انھیں قدروں سے اقلیمِ انسانیت کی سرحدیں وسیع ہوئی ہیں۔ یہ ادبی روایات نہ صرف ہندوستانی ادب میں کارفرما رہی ہیں بلکہ ایرانی ادب کی بھی بنیادیں ہیں... تمام ایرانی شُعرا نے محبت کی قدروں کو آگے بڑھایا ہے اور تمام مذہبی تعصبات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا ہے۔ یہ روایات ایرانی ادب میں اس قدر جڑ پکڑ گئیں کہ بالآخر یہی شاعری کا فن قرار پایا۔"(10)

ایرانی ادب میں اس کی نمایاں ترین مثال خواجہ حافظ کا کلام ہے،جس میں انسان دوستی کی روایات انسانی قدروں اور مذہبی تعصبات سے دامن بچانے کی کئی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ فردوسی کا نام ایرانی حریتِ فکر اور اپنے کلچر سے محبت کے ضمن میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ فردوسی ایران پر، عربوں کے حملوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ شعرا کا مسلک ہمیشہ محبت، امن، بھائی چارہ،مساوات اور انسان دوستی کے کلچر کے فروغ کی صورت میں نمایاں رہا ہے۔جس طرح ایران میں شعرا انسان دوستی، مساوات اور محبت کی اقدار و روایات کے احیا کے لیے کوشاں رہے ہیں۔اسی طرح غیر منقسم ہندوستان میں بھی اُردو اور دیگر مقامی زبانوں کے شُعرا کا یہی شیوہ رہا ہے۔ ویدک اور ہندو سماج کے خلاف اوررجعت پسندی کو ناپسندیدگی کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح پرولتار یہ کے کلچر میں بھی محبت کی روایات کے لیے کام جاری رہا ہے۔ مذکورہ تناظر میں پروفیسر ممتاز حسین نے لکھتے ہیں:

"ہندوؤں کے درمیان بھی تجدیدیت اور کٹّرپن کے خلاف ہندو شُعرا جنگ کرتے رہے۔ کبیرؔ، سور داس، بہاری، چندی داس اور گرونانک اسی کلچر کے رہنما تھے اور جس طرح مسلمان صوفیوں نے عوام سے قریب تر ہونے کے لیے فارسی زبان چھوڑ کر ملکی زبان میں شاعری کی ہے۔ اسی طرح ہندی صوفیوں نے بھی سنسکرت زبان کو ترک کرکے عوام کی زبانوں کو اپنایا ہے۔ہندو اور مسلمانوں کی یہ مِلی جُلی روایات نئے انسان کی تعمیر میں اس وقت تک کام کرتی رہیں جب تک کہ مغلوں کے سینے صاف تھے اور ہندوستان نے خانہ جنگی کی وبا میں گرفتار ہوکر اس کا موقع نہیں دیا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنے اثراور اقتدار کو بڑھانے کے لیے مذہب کا نعرہ استعمال کریں، لیکن یہ خلیج اس وقت بھی اتنی وسیع نہ ہوسکی جتنی کہ برطانیہ کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔"(11)

غیر منقسم ہندوستان کی بشریاتی تاریخ میں ادب کے وسیلے سے صوفی شعرا کا کردار سماج میں امن اور محبت کے فروغ کے لیے بلاتخصیصِ مذہب بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ صوفیا کا مسلک انسان دوستی اور مشترکہ کلچر تھا۔ وہ عام انسانوں سے محبت کرتے تھے۔ مساوات اُن کا بنیادی درس تھا۔ عوام کی زبان میں شعر و ادب تخلیق کرنے پر انھیں سرشاری کا احساس ہوتا تھا۔ وہ پرولتاری کلچر کے نمایندے تھے۔ انھوں نے زبان یا مذہب کو منافرت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ مغلوں کے زوال کے بعد دو طبقاتی سماج میں نوآبادیاتی استعمار نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میں تاریخ، زبان اور مذہب کو بنیاد بنا کر غیر منقسم ہندوستان میں منافرت کی آگ کو تیز تر کردیا تھا، برطانوی استعماری قوت کا بنیادی مقصد اپنے معاشی و اقتصادی ایجنڈے اور مفادات کا تحفظ اور اپنے مفادات کے حصول کو یقینی بنانا تھا۔ اسی لیے نوآبادیاتی دور میں انگریز استعمار کار نے ہندوستان کے پرولتاری کلچر میں نہ صرف دراڑیں ڈالیں بل کہ پاپولر کلچر کی شناخت ہی کو مجروح کرکے رکھ دیا، نوآبادیاتی دور میں مقامی حاشیائی آبادی کو نوآباد کاروں نے اپنی تقلید پر جبریہ طور پر مجبور کیا۔ مقامی لوگوں کو یہ تک باور کروایا جاتا رہا کہ اُن کی زبان، سماجی ادارے اور کلچر کم تر درجے کے ہیں۔اِس طرح مقامی کلچر کو نہ صرف دبا کر مسخ کیا گیا بل کہ برطانوی نوآباد کار نے استعماری حربوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مذہبی و لسانی منافرت کا بیج بھی بویا اور اُسے مقامی لوگوں کے لہو سے ہی سینچا۔کلچر کا ایک تفاعل یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کے مابین مشترکہ دلچسپیوں کے کارن وحدت پیدا کرے، غیر منقسم ہندوستان میں مشترکہ کلچر کے خاتمہ کے لیے نوآبادیاتی دور میں متعدد حربے استعمال کیے گئے جب کہ کلچر تو انسانوں کی باہمی ضرورتوں کے پیشِ نظر جوڑنے کا فریضہ سر انجام دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں میں وحدت و یگانگت قائم رکھنے کے لیے حقیقی مساوات کا بھی علم بردار ہے:

Terry Eagletonکے مطابق:

"حقیقی مساوات یہ نہیں کہ ہر کسی سے یکساں سلوک روا رکھا جائے بلکہ ہر ایک کی مختلف ضروریات سے مساوی طور پر نبٹا جائے۔"(12)

لوگوں کی معاشی اور بنیادی ضرویات کا خیال رکھنا از بس ضروری ہے۔پروفیسر ممتاز حسین نے ان اسباب اور محرکات کا جائزہ پیش کیا ہے جن کی بدولت پاپولر کلچر کو ہر حال میں پسماندہ رکھنے کے لیے کام کیا جاتا ہے، عام انسانوں یعنی پرولتاری کلاس جس میں کسان، مزدور اور محنت کش لوگ شامل ہیں، ان کے کلچر کو ادنیٰ رکھا جاتا ہے۔ انھیں بورژوا کلاس، وسائل سے محروم رکھتی ہے۔ رجعت پسند قوتیں انھیں تعلیم سے بھی محروم رکھنے کے لیے کام کررہی ہوتی ہیں۔ مادّی قوتیں ان کا تسلسل کے ساتھ استحصال جاری رکھتی ہیں۔ مذہبی قوتیں ان کو ایسے معاملات میں الجھائے رکھتی ہیں، جن سے ان کے عقل و شعور کی ترقی کا عمل پسماندگی کی طرف موڑا جا سکے، جیسے برہمنیت نے ماضی میں اشوک کے بعد کے زمانے میں بدھ دھرم کی جگہ ویدک دھرم اور پالی کی جگہ سنسکرت کو مسلط کردیا تھا اور ہندوستان کی قدیم اقوام کی مذہبی کتب کو بھی سنسکرت میں منتقل کردیا تھا۔ اس طرح قدیم زمانے کی پرولتاری کلاس کے کلچر کو مسخ کرنے کے لیے کام کیا جاتا رہا۔ درحقیقت کلچر، ذہن انسانی کے تربیت یافتہ ارتقا کے لیے کام کرتا ہے، فی الاصل کلچر انسانی فکر و نظر کے تربیت یافتہ ارتقا کی ہی ایک صورت کا نام ہے۔ کلچر بنیادی طور پر انسانی اذہان اور افکار و تصورات کا داخلی اظہار ہے۔ تخیّل میں جس قدر وسعت و رفعت ہوگی، اسی قدر اس کا اظہار ہوگا۔ انسانی زندگی کے لیے وہ تخیّل ہی مفید ہوگا جو کلچر اور معاشرے کا باہمی رشتہ افرادِ معاشرہ کے ساتھ جوڑ کر وحدت کی لڑی میں منسلک کرتا ہے۔ وہ طاقتیں جن کا وسائل پر کنٹرول ہے، وہ وسائل اور ذرائع پیداوار کو اپنے مفادات اور مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس طرح بورژوا گروہ یا طبقہ پرولتاریہ کے شعور پر اثر انداز ہوکر اسے ایک طرف رجعتی عناصر کے ہاتھوں غربت و پسماندگی کی طرف لے جاتا ہے تو دوسری اس کے کلچر کو کنٹرول کرکے التوا کا شکار کرتا ہے۔جب یورپ میں پندرھویں صدی میں نشأۃِ ثانیہ کی تحریک کا آغاز ہُوا تو اُس وقت سرمایہ دار طبقے نے ان تمام قوتوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جب تک کہ سرمایہ داروں کو اُن کی ضرورت تھی۔ جاگیردارانہ نظام بھی مفلوج ہوچکا تھا، اور وہ سامراج سے مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ جاگیردارانہ نظام فکر میں مذہب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سائنس اور عقل کے اُصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر اہلِ مغرب نے جاگیردارانہ نظام فکر پر حملہ کیا اور اس نظام کو توڑنے کے لیے یورپ کے سرمایہ دار طبقے نے کاوشیں کیں۔ فرانسیسی انقلاب میں جاگیردار طبقے کو سرمایہ داروں نے اپنی ضرورت کے مطابق عوام کے خلاف استعمال کیا اور مذہب کو سیاسی نظام کا پاسبان بنایا۔ اس پاسبانی کے فرائض سرمایہ دار طبقے کے لیے یورپ میں کلیسا نے انجام دیے۔سرمایہ دارانہ نظام نے یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے لیے چرچ کے اداروں پر بھی فکری یلغار کی، جب سرمایہ دار طبقہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگیا تو اس نے مذہب کی ازسرِ نو توجیہات پیش کیں اور عوام کے کلچر اور اس کے عقل وشعور کو سُلانے کے لیے مذہب سے افیون کا کام لینے کی بھر پور کوشش کی گئی مگر سائنس نے عقل کی توجیحات کے مصنوعی معیارات کو کام نہ کرنے دیا تو سرمایہ داروں نے مذہب کوجذباتی اور صوفیانہ انداز کا حامل بنادیا۔ اس طرح اہلِ مغرب نے مذہب کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر ایک لبرل قسم کا فلسفہ تیار کیا، غیر منقسم ہندوستان میں برطانوی سامراج نے ہندوؤں اور دیگر ا قوام کے ذریعے عوامی کلچر اور عوامی فکر کو سُلانے کے لیے مختلف حربوں کا استعمال کیا۔ اس تناظر میں پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

"ہمارے ملکی مصلحین نے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان،اس قسم کے مذہب کی تلقین کی۔ یہ سامنتی نظامِ فکر سے ایک قسم کا سمجھوتہ تھا کیوں کہ متوسط طبقے کا گہرا تعلق زمیندار طبقے سے تھا جو سامراجیوں کا نمایندہ بن کر کسانوں کی لُوٹ کھسوٹ میں مبتلا تھا۔ یہ طبقہ جس کے وجودکا ضامن انگریزی راج ہے، جاگیردارانہ اُسلوب سے اپنے باج گُزاروں کو لُوٹنا

چاہتا ہے۔ ادھر متوسط طبقے میں جو چھوٹا سا تاجر طبقہ اُبھررہا تھا۔ اس کی تجارت کا دارو مدار بھی انگریزی تاجروں کی معاونت ہی میں مضمر تھا۔ یہی وہ اسباب تھے کہ ہندوستان میں نشأۃِ ثانیہ کی تحریک صرف ایک ہلکی سی فکری تحریک بن کر رہ گئی جس کا دائرہ اُوپری اور متوسط طبقے تک ہی محدود رہا۔ اس تحریک کا تعلق عوام کی زندگی سے نہ تھا اور نہ اس نے ہندوستانی تہذیب اور عوامی کلچر کی طرف توجہ کی۔"(13)

پروفیسر ممتاز حسین کے پیشِ نظر وہ تمام محرکات ہیں جنھوں نے ہندوستان کے پرولتاری کلچر کو پنپنے نہ دیا۔ مثلاً انگریز سامراج نے نوآبادیاتی ہندوستان میں جس تعقل پسندی کی تحریک کا آغاز کیا تھا، در پردہ اس کے بھی نو آبادیاتی، سامراجی و استعماری، معاشی و اقتصادی مفادات کا حصول ہی تھا۔ نوآبادیاتی استعمار کار نے ہندوستان میں ایک طرف مقامی سرمایہ دار طبقہ پیدا کیا جو بین الاقوامی سرمایہ داروں کے لیے کام کررہا تھا۔ اس کے مقاصد اور مفادات انگریز استعماریت کے ساتھ تعلق استوار کرنے میں ہی موزوں تھے تو دوسری طرف انگریز استعماری قوت نے عوامی اقدار و روایات کی نہ صرف شناخت کو مجروح کیا بل کہ اُسے ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچایا نیز نوآبادیاتی استعماری طاقت کے مفادات کے لیے کام کرنے والے مقامی سرمایہ دار نے مغربی کلچر، انگریزی زبان، اور مغربی اقدار و روایات کی اندھی تقلید کو بھی اپنے لیے ضروری خیال کیا۔ اس طرح برصغیر میں مشترکہ کلچر کو پھلنے پھُولنے نہ دیا، چوں کہ مشترکہ روایات،مشترکہ اقدار کے پنپنے سے عوامی تحریکوں میں استحکام پیدا ہو سکتا تھا۔ معاشرے میں وحدت و یگانگت اوربھائی چارے کی فضا ہموار ہوسکتی تھی۔لہٰذا ہندوستان میں اس پیٹرن کی وحدت انگریز استعمار کار کوتو بالکل بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس ضمن میں پروفیسر ممتاز حسین رقم طراز ہیں:

"ہندوستانی کلچر کو اگر ایسے کسی ایک نام سے یاد کیا جاسکتا ہے تو وہ مشترکہ کلچر ہے جس نے بے شُمار قوموں اور گروہوں کے اثرات کو قُبول کرکے مشترکہ قدروں پر بڑھنے کی کوشش کی ہے اور ان مشترک قدروں کی آمیزش ہمیشہ عوامی تحریک اور عوامی کلچر کی کوششوں سے ہوئی... انگریزوں کے آنے سے پہلے ہی ہندوستان کی زندگی میں جو سیاسی انتشار پھیل چکا تھا۔ اس نے کلچر کی وحدت اور مشترک قدروں کو بھی صدمہ پہنچایا۔ انگریزوں کے لیے ہماری تمدنی وحدت کا انقطاع ہماری سیاسی موت سے زیادہ اہم تھاکیوں کہ قومی تحریکوں کی زندگی میں مضبوطی اور استواری کلچرہی کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔ سیاسی اعتبار سے تو ہندوستان برطانوی راج میں ایک زنجیر میں منسلک کردیا گیا، لیکن انگریزوں کے زمانے میں کوئی ایسی تحریک نہ اُٹھنے پائی جو ہندوستانی کلچر کی مشترک قدروں کو استوار کرسکتی بلکہ ایسی طاقتوں کو قوت پہنچائی گئی جن میں دُوری اور اختلافات کی راہیں زیادہ روشن تھیں۔ ہندوستان کے نشأۃِ ثانیہ کی بنیاد ٹیڑھی پڑی اور اس بنیاد میں انگریز کا بھی ہاتھ تھا۔"(14)

نوآبادیاتی دور میں برٹش استعماری قوت نے ہندو، مسلم کے مابین ثقافتی اشتراکات و انسلاکات کی تمام صورتوں کو توڑا۔انگریزوں سے قبل غیر منقسم ہندوستان کا مشترکہ کلچر برہمنوں، پروہتوں کو قبول نہیں تھا۔ انھوں نے عوام کو اپنے قریب لانے کے لیے ویدک مذہب اور فلسفے کو ایک طرزِ معاشرت کا نام دیا۔ اچھوتوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ویدک دھرم کی از سرِ نو روح کا جائزہ لیا مگر برہمنیت کا یہ منصوبہ ہندوستان کی سیاسی کارگزاری میں فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ اس طرح برہمنیت، اچھوتوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔نوآبادیاتی دور میں انگریز استعمار کار، تقسیم سے قبل کے ہندوستان کے ذہن و فکر اور کلچر کا باریک بینی سے تجزیہ کرچکا تھا۔ اس لیے بھی اس نے مشترکہ کلچر پر کاری ضرب لگائی۔ نوآبادیاتی دور میں برٹش امپیریل طاقت نے ہندو، مسلم مخلوط کلچرکو اپنے لیے انتہائی مضر تصور کرتے ہوئے، ہندوستان کے عوام میں مشترکہ اقدار، روایات، طرزِ فکر و عمل اور طرزِ احساس کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش پر عمل درآمد کیا۔ برٹش امپیریل قوت نے ہندوؤں کو یہ باور کروایا کہ مسلمان باہر سے آئے ہوئے حملہ آور ہیں اور ان کے (ہنود) ملک اور وسائل پر قابض چلے آرہے ہیں۔ انگریز سامراج نے تاریخی طور پر بھی ہندوؤں کو یہ باور کروایا کہ

ان کی الگ بشریاتی، معاشرتی، مذہبی اور لسانی تاریخ ہے۔ اس طرح مشترکہ کلچر کی بیخ کنی کی گئی۔ انگریزکو گوارا ہی نہیں تھا کہ ہندوستان کے عوام میں مساوات پیدا ہو، بھائی چارے کی فضا ہموار ہو،ان کی روایات میں یہ عنصر شامل ہو کہ وہ دکھ، سُکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ ان میں یگانگت، یکجہتی اور وحدت پیدا ہو۔ اگر ہندوستان کے مقامی کلچر میں ایسے اوصاف قائم رہتے تو انگریز سامراج ہندوستان میں اپنے مفادات کو محفوظ نہ بناسکتا۔ انگریز سامراج نے ہندوستان میں ایک ایسا سرمایہ دار طبقہ پیدا کیا، جس نے بھی ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ شروع کی۔ بین الاقوامی سیاق و تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے، غیر منقسم ہندوستان کے مقامی سرمایہ داروں نے نہ صرف اپنی اقتصادیات کو مضبوط کرنے پر اکتفا کیا بل کہ اُنھوں نے انگریز سامراج کے ساتھ شریک ہوکر مقامی صنعتی معاملات کو تہ و بالا کرنے میں بھی حصہ لیا اور مقامی سطح پر میں انگریز دشمنی کے عناصر کو کم کرنے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے سماج میں بورژوا کلچر نے ہند مہاسبھا کی سرپرستی کی، سرمایہ داروں اور نودولتیوں نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح پرولتاری ثقافتوں کو ذلت و پستی اور پسماندگی کی طرف دھکیلتے ہوئے ترقی پسند اقدار کا خاتمہ کیا۔ہندوستان کے مقامی کلچر کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں انگریز سامراج کے ساتھ مقامی بورژوا کا بھی برابر کا ہاتھ تھا۔ ان تمام مذہبی، لسانی، ثقافتی، معاشی ہتھکنڈوں، جن سے انگریز سامراج نے کام لیتے ہوئے، ہندوستان میں پرولتاری کلچر کو مفلوج کیا اور زبان و ادبیات کو بھی کم تر قرار دیا۔مذکورہ سیاق میں پروفیسر ممتاز حسین نے اپنے ترقی پسندانہ نظریات اور انسان دوستی کے سیاق میں لکھا ہے :

"انگریز سامراج اور ملکی سرمایہ داروں نے رجواڑوں کو اپنے ساتھ لے کر سیاسی اور اقتصادی جنگ کو فرقہ وارانہ جنگ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس جنگ کے تین پہلو ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ۱) فرقہ وارانہ جنگ سے انگریز دشمنی کا جذبہ ختم ہوگا۔ ۲) فرقہ وارانہ جنگ میں ہندو اور مسلم مزدور اور کسانوں کا اتحاد ختم ہوگا۔ ۳) فرقہ وارانہ جنگ نقص امن کا شاخسانہ بنے گی، جس سے شہریوں کی آزادی سلب کی جاسکتی ہے۔ ۴) فرقہ وارانہ جنگ کو بڑے پیمانہ پر بڑھا کر پاکستان اور ہندوستان کی جنگ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو فرقہ وارانہ جنگ کے سیاسی پہلو ہیں، لیکن عوام کے کلچر کو ختم کرنے کے لیے کچھ اور بھی تدبیریں سوچی گئی ہیں۔"(15)

برٹش سامراج کے لیے ضروری تھا کہ وہ عوام کے ذہن و فکر، میلانات و رُجحانات کا تجزیہ کر کے اُن کے کلچر پر کنٹرول کرتا، تاکہ انگریز کے خلاف مقامی سطح پر بغاوت بھی نہ ہو اور اس کے مفادات کو بھی گزند نہ پہنچنے پائے۔ انھوں نے ہندوستان کے پرولتار یہ میں مزدوروں اور کسانوں کی وحدت ختم کرنے کے لیے مقامی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو نہ صرف مضبوط کیا بل کہ بھر پور طریقے سے اُن کی پشت پناہی بھی کی۔ لسانی منافرت کو بھی ہوا دی۔ ہندوستان کے قدیم کلچر کا بھی انگریز سامراج نے اپنے مخصوص ایجنڈے کے تحت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا جو زیادہ تر دیہی زندگی اور دیہی سماج کی صورت میں موجود تھا تاکہ مقامی آبادی کو مکمل طور پر قابو میں رکھا جا سکے،اِس ضمن میں انگریز نے ہندوستان کے مختلف خطوں کے اذہان اور دیگر مقامی عناصر کے مطالعات پر مبنی گزیٹیئر بھی شایع کیے، جن میں مقامی آبادی کی ذاتوں، نسلوں کے اوصاف اور جغرافیائی صورتِ حال کے بھی جائزے لیے گئے۔ کسانوں کی ترقی سے بھی انگریز کو خطرات لاحق تھے۔ اس کو کُچلنے اور اس کے دیہی طرزِ زیست کو گزند پہنچانے کے لیے بھی منظم بنیادوں پر کام کیا۔ اس طرح غیر منقسم ہندوستان کی ثقافتوں کے مطالعات و تجزیات کے بعد برطانوی سامراج نے ہندوستان میں ہندو، مسلم فرقہ واریت کا بیج بویا۔ پروفیسر ممتاز حسین مذکورہ سیاق و تناظر میں لکھتے ہیں:

"۱) ملکی زبان کا ادبی سرمایہ غارت گروں اور ظالموں کے خلاف ہے۔ ۲) دیہات کا کلچر ہندو، مسلم اتحاد کی بنیاد ہے۔ ۳) سائنسی علم، کتب خانے، انسانیت کا پرچار کرنے والے ادارے یہ سب چیزیں عوام کو متحدہ طور پر ظالمانہ اور طبقاتی نظامِ حکومت ختم کرنے پر اکسا رہے ہیں۔ ۴) مسلمانوں کی اقلیت ہمیشہ ایک مشترکہ کلچر کو تصور میں سوچتی آئی ہے۔ ان کی تحریک سے برہمنیت کو سخت چوٹ پہنچی ہے۔ ذات پات کی دیواریں متزلزل ہوئی ہیں۔ اس

مخلوط کلچر کو اسلامی کلچر کہہ کر ان کو روحانی طور پر گھائل کیا جائے تاکہ ہندو عوام سے مشترکہ رشتہ قائم نہ ہوسکے۔ ۱) کی رُو سے سنسکرت زبان کا نعرہ بلند کیا گیا۔ ۲) کی رُو سے دیہاتیوں میں ہتھیار تقسیم کیے گئے اور انھیں خُوں ریزی میں مبتلا کرکے کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کیا گیا۔ ۳) کی رُو سے ڈاکٹر، پروفیسر قتل کیے گئے، بہت سے سائنس کے تجربہ خانے اور کتب خانے جلائے گئے۔ ۴) کی رُو سے اُردو زبان پر حملہ کیا گیا، اُردوزبان کو غیر ملکی اور مسلمانوں کی طرزِ معاشرت کو غیر ملکی بتایا گیا۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں پہلے پاکستان میں ہوئیں اور پھر ہندوستان میں،کیوں کہ برطانوی معاہدے کی رُو سے دونوں ملکوں میں ان چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔"(16)

پروفیسر ممتاز حسین کا تجزیہ کلامیے کی بنیاد پر ہے، انھوں نے انگریز سامراج کے مذکورہ ذہن و فکر کا تجزیہ زمینی حقائق کی بنیاد پر کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ استعمار کارکے حربوں کا مقصد ہندوستان کے سیاسی نظام کا صرف خاتمہ نہیں بلکہ ہندوستان کے مشترکہ کلچر کو بھی موت کے گھاٹ اُتارنا تھا، یہ وہ مخلوط کلچر تھا جس کی جڑیں ہندوستان کے طول و عرض کی معاشرتی زندگی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریز استعمار کارنے لسانی، بشریاتی،معاشرتی، مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کے طول و عرض کی زندگی کو نہ صرف پراگندہ کیا بل کہ غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئے طرزِ زیست کو بھی نقصان پہنچانے کے مختلف حربوں کو استعمال کیا۔ انگریز استعمار نے لسانی، معاشرتی،تاریخی اور مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کے عام لوگوں کو باور کروایا کہ ہندوستانی سماج درحقیقت دو طبقاتی نوعیت کا حامل سماج ہے۔ اس میں مسلمان باہر سے آئے ہوئے، غیر ملکی حملہ آور ہیں، ان کا کلچر، بشریاتی تاریخ اور زبان بھی غیر ملکی ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کو باور کروایا کہ وہ یہاں کے مقامی لوگ ہیں، ان کی مذہبی، معاشرتی، لسانی اور ثقافتی و بشریاتی تاریخ مسلمانوں سے نہ صرف قدیم بل کہ بالکل الگ تھلگ نوعیت کی حامل ہے اور اس طرح ہندوؤں کی بالادستی کو حتمی شکل دینے کی کوشش میں سنسکرت کی بالادستی کے لیے بھی کام کیا گیا۔سنسکرت کو یونانی اور لاطینی سے بھی زیادہ زرخیز اور شستہ قرار دیا گیا۔ وہ ا قوام جو انگریز سامراج کے تسلط سے قبل مشترکہ کلچر رکھتی تھیں۔ ان کو تاریخی، لسانی، مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کرکے انگریز استعمار نے اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول کو نہ صرف یقینی بنایا بل کہ انھیں حتمی شکل بھی دی۔ ہندوستان کے عام انسانوں کے مخلوط کلچر میں منافرت کا بیج بو کر اسے بھر پور نقصان پہنچایا۔ آزادی کے بعد تو انگریز سامراج نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لکیر کھینچ کر ہندو اور مسلمان کے مابین ذہنی و فکری تقسیم کی کو حتمی شکل دے دی۔ مقامی آبادی کے عام لوگوں کو یہ تصور ہی نہیں دیا گیا کہ ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ ان کی بھی سماجی زندگی میں پہلے سے بہتری اُن کا بنیادی حق ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم کو ختم کرنے کا تصور ہی اُجاگر نہیں کیا گیا۔ البتہ ان تصورات کو ضرور جنم دیا گیا جو مزدوروں کو سرمایہ دار سے صلح کرکے رہنے کی جانب راغب کرنے والے ہرگز نہیں تھے۔ اس طرح ایک ایسی تقسیم کی گئی کہ جس نے ہندو، مسلم مشترکہ کلچر، مشترکہ زبان و ادبیات، مشترکہ روایات، مشترکہ اقدار اور نظامِ زندگی کو ہی ختم کرکے رکھ دیا۔

زبان اور کلچر کا آپس میں نہایت گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ زبان اور کلچر کے اِسی گہرے تعلق کی بدولت ادب کا کردار بھی کلچر کے ضمن میں نہایت اہم ٹھہرتا ہے۔ کسی کلچر پر دوسرے کلچر کا سب سے نمایاں اظہار زبان کی صورت میں ظاہرہوتا ہے جو آہستہ آہستہ پورے کلچر پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ تخلیقی قوت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ادب ہے جو زبان کی بدولت ہی ممکن ہوتا ہے۔ کلچر اور زبان کے اِسی ناگزیر تعلق کی بنا پر ڈاکٹر ناصر عباس نیر کلچرل شناخت کے لیے زبان کو سب سے اہم سمجھتے ہیں اور زبان کو کلچر کا چہرہ قرار دیتے ہیں۔ اِس ضمن میں اُن کی رائے ملاحظہ ہو:

"اگر کسی ثقافت پر کوئی دوسری زبان مسلط کر دی جائے تو وہ ثقافت زرد پڑ جاتی ہے؛ وہ حاشیے پر چلی جاتی ہے اور اپنی داخلی اور حقیقی تخلیقی قوتوں کے اظہار سے قاصر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی انسانی گروہ کی ثقافتی شناخت کا سب سے اہم مظہر زبان ہے۔ زبان،

ثقافت کا چہرہ ہے۔"[17]

کلچر، فرد اور معاشرے کے ان رشتوں سے جو جبلّتوں کی ترقی اور ان کی تنظیم و ترتیب سے جنم لیتا ہے۔ اور کلچر ہی افرادِ معاشرہ کے سماجی رشتوں کو مستحکم کرتا ہے اور معاشرے کے تمام طبقات یا گروہوں کی نگہداشت کا فریضہ بھی کلچر ہی سر انجام دیتا ہے اور زبان سماج میں تصورات کو راسخ کرنے، کسی بھی آئیڈیالوجی کا بیانیہ استوار کرنے کا بنیادی ٹول ہوتی ہے۔ افرادِ معاشرہ اپنے اوصاف و کمال اور اعمال میں انفرادی رُجحان بھی رکھتے ہیں مگر سماجی شعور جو مادّی زندگی کے تابع ہے، اُنھیں معاشرے کے کلچر کے تابع کرتا ہے۔ یہ سماجی شعور درحقیقت کلچر ہی کا زائیدہ ہے۔ کلچر کا کمال یہ ہے کہ وہ ملکی سطح پر افرادِ معاشرہ کو الگ تشخص عطا کرتا ہے۔ یہ شناخت اس کے طبقے اور معاشرے کی بھی ہوتی ہے، یہاں بھی زبان ہی تصورات کو ظاہر و باہر اور راسخ کرنے کے لیے مرکزی کردار کی حامل ہوتی ہے۔معاشرتی سطح پر کلچر زبان کو بروئے کار لاتا ہے، اس طرح معاشرتی زندگی اور سماج میں افراد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ کلچر سے الگ ہوکر فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواسکتا ہے۔ کلچر، سماج کو وحدت، اور یگانگت کی لڑی میں پروتا ہے۔ بورژوا کلچر اور اشرافیہ کو گوارا نہیں کہ پرولتاری کلچر میں وحدت اور ارتفاع پیدا ہوسکے۔نوآبادیاتی دور میں استعماری قوت نے زبان کی سطح پر بھی آویزش کی راہ نکالی۔ ہندو، مسلم کی تقسیم کے لیے اُردو، ہندی دونوں کو رسمِ خط کی سطح پر بھی منقسم کیا۔ نفرت کی بنیاد پر دیو ہیکل عمارت قائم کرکے اپنے مقاصد کو یقینی بنانے کا ہر حربہ بروئے کار لائی۔

ادب اپنے معاشروں کی عکاسی کرتا ہے۔ادب کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کوبھی جنم دیتا ہے۔ اسی طرح شعر و ادب انسانوں کی نفسیات پر اثر انداز ہو کر نئی اقدار کی تشکیل و تعمیر کا بھی فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب خارجی زندگی پر اثر انداز ہو کر اسے تبدیل کرنے کا بھی کردار نبھاتا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین نے ادب اور سائنس کو ایک دوسرے کا معاون قرار دیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کا تعلق تجرباتِ انسانی سے ہے جب کہ ادب میں انسانی تجربات مواد یا موضوع اور ہیئت کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں اور سائنس، تہذیب کے لیے ارتفاع کا کام کرتی ہے۔ علوم و فنون (آرٹ) اور سائنس کا تعلق انسانی سماجیاتی زندگی کے داخلی اور خارجی عوامل کے ساتھ منسلک ہے۔ شعر و ادب اور فن کا تعلق انسان کی داخلی و فکری زندگی سے ہے جب کہ سائنس خارجی یا تہذیبی صورتِ حال سے جُڑا ہوا مضمون ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر ممتاز حسین کی رائے ملاحظہ کی جا سکتی ہے:

> "آرٹ، زندگی اور فطرت کی حقیقت کو براہِ راست اور جذباتی تحریک کے ساتھ پیش کرتا ہے اور سائنس، زندگی اور فطرت کی حقیقت کو مجرد اور جذبات سے عاری ہوکر پیش کرتی ہے۔ سائنس خاص سے عام، محسوس سے مجرد کی طرف بڑھتی ہے اور آرٹ عام سے خاص اور مجرد سے محسوس کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ انسانی سماج، ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرکے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"[18]

فنونِ لطیفہ کا تعلق کلچر سے ہے جب کہ سائنس اور دیگر سماجی علوم خارجی سطح پر تہذیبی عناصر و عوامل کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ تمام علوم جو انسانی ذہن و فکر سے متعلق ہیں اور داخلی اظہار کی عکاسی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، وہ کلچر کی قلم رو کا حصہ ہیں۔ فرد، طبقے اور معاشرے کے نامیاتی رشتوں کے نتیجے میں کلچر کا ظہور ہوتا ہے جو انسانی ذہن کے ارتفاع اور باہمی ترتیب و انضباط کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ کلچر، فرد، طبقے اور سوسائٹی کے درمیان اٹوٹ رشتہ قائم کرکے فرد، طبقے اور سوسائٹی کے کلچر کی صورت منصّۂ شہود پر آتا ہے۔اس طرح سماج میں علوم و فنون سماجی شعور کو جنم دیتے ہیں،ٹھوس تہذیبی ترقی کا وسیلہ بنتے ہیں جب کہ ذہن و فکر سے منسلک عناصر و عوامل درحقیقت کلچر کی ہی پیداوار ہیں۔ زبان، شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ معاشرے اور کلچر کی

عکاسی کرتے ہوئے جذبات و احساسات کو بھی شامل کرتے ہیں جب کہ سائنس خارجی زندگی اور فطرت کے حقائق کو بغیر جذبات و احساسات کے پیش کرتی ہے۔ اس طرح کلچر اور انسانی معاشرہ ترفع کی طرف پیش قدمی کرتا رہتا ہے۔کلچر کے اجزائے ترکیبی میں شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ (آرٹ) انسانی زندگی ہی کی ترجمان ہیں۔ شعر و ادب اور آرٹ کا فریضہ اعلیٰ انسانی کلچر کو پیدا کرنا ہے۔ سماج کے اندر شعر و ادب کی دنیا میں یہ فریضہ شُعرا و ادبا اور ناقدینِ فن سرانجام دیتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

"ادب ویسا ہی ایک سماجی فن ہے جیسا کوئی اور... شاعر یا ادیب کا کام انسان بنانا ہے، لیکن انسان اس وقت تک نہیں بنتا جب تک سماج کی تعمیر نہ ہو۔ اس لیے وہ سماج گر بھی ہے۔"(19)

پروفیسر ممتاز حسین درحقیقت ترقی پسند نظریے سے وابستہ نقاد ہیں اور انسان کی ترقی و ارتقا کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ وہ ادب کو سماجی فن کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے نزدیک ادب اعلیٰ کلچر کے جنم کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اعلیٰ کلچر میں اعلیٰ انسان پیدا ہوتے ہیں جو اعلیٰ سماج کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔ اس لیے پروفیسر ممتاز حسین اعلیٰ سماج کی تعمیر کے لیے ترقی پسند فکر اورنظریے کے قائل ہیں اور یہ تفاعل ادب کے ذمے ہے۔ وہ طبقاتی کشمکش کو سماج اور کلچر کے لیے تحرک کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تبدیلی انسان ہی کا کام ہے۔ اس لیے وہ ادیب کے لیے ترقی پسندانہ فکر اور نظریے سے وابستگی کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس طرح ادب انسانی سماج اور کلچر کے لیے تحرک اور کاوش کا فریضہ انجام دے کر اپنا بھرپور کردار ادا کرسکتا ہے۔ ان کے نزدیک ادیب اپنے طبقے اور معاشرے کے کلچر کا، جس میں وہ رہ رہا ہوتا ہے، اس کی نمایندگی بھی کرتا ہے، اور اس کی ترجمانی کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔ کلچر میں ہر فرد اپنے طبقے کی نمایندگی کرتا ہے اور اپنے نظریے سے وابستگی بھی رکھتا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین بہ حیثیت نقاد اپنے طبقے اور پرولتاریہ سے نظریاتی وابستگی کو اعلیٰ ادب کی تخلیق اور فروغ و اشاعت کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ ادیب کی اپنے کلچر یا نظریے یا طبقے سے وابستگی اور نمایندگی کو پروپیگنڈا قرار دینا، ان کے نزدیک دیگر نظریات سے وابستہ ناقدین کے تعصبات و ترجیحات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ ادب کو کلچر کا زائیدہ سمجھتے ہیں اور ادب میں تخیّل کی کارفرمائی سے جذبات و احساسات کی عکاسی کے بھی قائل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ادب میں وہ فنی لوازمات کے بھی قائل ہیں۔ شعر و ادب سماجی و ثقافتی ذہن و فکر کے شعور کا اظہار داخلی سطح پر تخیّل کی کارفرمائی سے کرتے ہیں۔ اس لیے ادب و فن کی نظریے اور کلچر سے وابستگی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو سوسائٹی اور کلچر میں ارتفاع پیدا نہیں ہوسکے گا۔ شاعر، ادیب کا کام ادب کو نظریے کے وسیلے سے نئی ہیئت، نئے تجربے اور نئی وحدت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح سماجی زندگی اور کلچر میں توازن پیدا ہوتا ہے جو سماجی زندگی اور کلچر میں آدرش، اعلیٰ روایات اور اعلیٰ اقدار کا باعث بنتا ہے۔ وہ ادب و فن میں ترقی پسند نظریے کے قائل ہیں اور اسی نظریے کے وسیلے سے اعلیٰ کلچر جو پرولتار یہ کی سماجی زندگی کے لیے بھی ضروری ہے، پیدا ہوسکتا ہے اور نسل درنسل اس اعلیٰ کلچر کی سماجی زندگی میں منتقلی کا عمل سُود مند ہوسکتا ہے۔تہذیب جو خارجی زندگی کی عکاسی کرتی ہے اور کلچر جو داخلی زندگی کے اظہار کی آئینہ داری شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ، فکر و فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کے ذریعے کرتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر ممتاز حسین تہذیب اور کلچر کے دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں سے ربط و تعامل کے اس لیے بھی قائل ہیں کیوں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے زندہ رہنے کے لیے لین دین کا عمل ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے:

"دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد کسی بھی قوم کا کلچر (خواہ وہ چین ہی کیوں نہ ہو، جہاں مغرب کے اثرات سے پہلے ہر شے کسی زمانے میں چینی نظر آیا کرتی تھی) ایسا نہیں ہے، جس میں خارج کے اثرات نہ پائے جاتے ہوں۔ اس میں شُبہہ نہیں کہ کلچر میں ایک رُجحان عصبیت کا بھی ملتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خارج کے اثرات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، لیکن جب وہ خارج کے اثرات کو اپنے اندر قُبول کرنے سے پیہم انکار کرتا رہتا ہے

تو وہ کلچر فنا بھی ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں فنا ہونے کے امکانات سے بچنے کے لیے دوسری تہذیبوں سے اور ان تہذیبوں کے زیر اثر مختلف ملکوں کے کلچر سے بھی استفادہ کرنا ہوتا ہے، چناں چہ آج یہ صورتِ حال نہ صرف ہمارے کلچر کی ہے بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں کی ثقافتوں (کلچرز) کی بھی ہے کہ وہ غیر ملکی بالخصوص مغربی اثرات کو قُبول کررہے ہیں۔ سعودی عرب کے کلچر میں بھی یورپ کا کلچر در آیا ہے، بقول اکبر، اب توانجن بھی مسلمان ہُوا چاہتا ہے اور اب تو حرم کی پاسبانی کا کام بھی امریکہ کے آواکس (AWACS)طیارے انجام دے رہے ہیں، چناں چہ اس ضرورت کو کہ اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہمیں اپنے کلچر کو عالمی تہذیب سے ربط دینا ہے۔"[20]

پروفیسر ممتاز حسین کلچر میں لین دین کے نظریے کے قائل ہیں، مکمل طور پر ثقافتی عصبیت کو کلچر کے لیے موت تصور کرتے ہیں۔وہ ثقافتی سطح پر نظریات کے رد و قبول کے حامی ہیں۔اس طرح وہ کلچر اور سماج کی حرکیات پر یقین رکھتے ہیں اور تہذیبی و خارجی سطح پر ٹیکنولوجی اور سائنس سے استفادے و حصول کو مثبت قرار دیتے ہیں، جیسا کہ حرم کی پاسبانی کے لیے اُنھوں نے امریکی طیارے AWACS کا تذکرہ کیا ہے، مراد یہ کہ ٹیکنولوجی سے بھی جُڑت قائم کرنے کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ تہذیبی سطح پر بھی وہ لین دین کو ترقی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ وہ تہذیبی زندگی پر اور ثقافتی سطح پر بھی افکار و خیال اور تصورات و نظریات سے اخذ و استفادے کو ترقی اور کلچر کی زندگی کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں۔ وہ کلچر جو لین دین ترک کردیتا ہے۔ وہ فنا کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ کلچر میں لین دین سماجی زندگی کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ کلچر کوئی جمود سے تعبیر شے نہیں ہے، اس لیے اس میں تحرک کے عناصر شامل ہیں۔ اس لیے یہ لین دین کرتا رہتا ہے۔ اُردو شعر و ادب نے انگریزی اور دیگر ادبیات سے لین دین کا سلسلہ ترک نہیں کیا۔ یہ بھی کلچر کے لیے ناگزیر عمل ہے جو تسلسل کے ساتھ معاشرتی زندگی میں جاری و ساری رہتا ہے۔ یہی صورتِ حال تہذیبوں میں خارجی سطح پر سماجی زندگی میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین کے نزدیک ادب سماج کی پیداوار ہے، واضح رہے کہ انسان اپنی سوسائٹی اور کلچر کے ذریعے سماجی حقائق اور اپنے مخصوص طرزِ زندگی کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک معاشرے یا کلچر کے تخلیق کار اپنے افکار کے ذریعے سماج میں پھیلی ہوئی انسانیت کی ازلی و ابدی حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ترقی پسندادب و انتقاد کی توجہ کا مرکز پرولتاری طبقے کے مصائب و مسائل ہی ہیں، زندگی کی مراعات سے جنھیں محروم کر دیا جاتا ہے، جس طبقے کو بورژوا طبقہ ہمیشہ حاشیے پر دھکیلنے کے لیے حکمتِ عملی کے تحت مستقل طور پر عملی تدابیرکرتا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ زندگی میں بنیادی ضروریات سے محروم طبقہ اقتصادی طور پر پسماندہ اور مجبور و مقہور ہی رہتا ہے یا رکھا جاتا ہے۔محروم طبقے کے ترجمان ادیب ہی اپنے ادب پاروں کے وسیلے سے پسماندہ طبقات کی آواز بنتے ہیں، اُنھیں شعور دیتے ہیں۔ترقی پسند ادب محض مسرت کا ذریعہ نہیں ہے جس طرح کلاسیکی ادب کا بنیادی تفاعل محض ذہنی تفریح و تسکین اور انبساط کا سامان کرنا ہے۔ ترقی پسند ادب و انتقاد تو زندگی کی صراحت کا فریضہ سنجیدگی کے ساتھ سر انجام دیتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب و نقاد نہ صرف افلاس زدہ، پسماندہ، پسے ہوئے محروم طبقے کی آواز بنتے ہیں بلکہ طبقاتی نظام پر کاری ضرب لگانا اُن کی آئیڈیالوجی کا بنیادی تفاعل ہے۔کلاسیکی ادب، محض جمالیات اور حصولِ مسرت اور ذہنی انبساط پر ہی توجہ صرف کرتا ہے جب کہ ترقی پسند تنقید اُس کلچر کی ترویج کے لیے حاشیائی آبادی کے شعور کو بلند کرتی ہے جس کا مقصد 'سُپر سٹرکچر' کو توڑنے کی سعی ہے۔کلاسیکی ادب میں زبان اور فن دونوں کا بنیادی کام جمالیاتی ذوق کی تسکین اور ذہنی تلذذ کا فریضہ سر انجام دینا ہے۔ دوسری طرف ترقی پسند ادب و انتقاد کا فرض اوّلیں سماج میں جوہری اور حرکیاتی تبدیلی کے لیے نظریاتی بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ترقی پسند آئیڈیالوجی کے مطابق زندگی، سماج اور کلچر حرکیات سے عبارت ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسانی اقدار اور بہترین مقاصد کے حامل ہوتے ہیں۔ ترقی پسند ادب اور تنقید میںStatusquoistجاریہ صورتِ حال کو توڑنے کے کلچر

کے فروغ پر بھرپور توجہ صرف کی جاتی ہے۔ ترقی پسند ادب و انتقاد ساقط و جامد زندگی میں تبدیلی کے نظریے پر توجہ صرف کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے اعلیٰ مقاصد، اعلیٰ انسانی اقدار اور انصاف پر مبنی غیر استحصالی کلچر اور صحت مند انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کو ضروری خیال کرتا ہے۔ ترقی پسند نقاد رجعت پسندانہ نظریات اور اس کی تمام تر کلاسیکی حرکیات کو توڑنے کے لیے ادب و انتقادی وسیلوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حاشیائی طبقے کے شعور کو ترفع اور بالیدگی عطا کرتا ہے۔اِس طرح وہ دُور رس سماجی نتائج کے حصول کے لیے اپنی آئیڈیالوجی کو عمل میں لاتا ہے۔

ترقی پسند نقاد پروفیسر ممتاز حسین نے اپنی تنقیدی نگارشات کے ذریعے سماج کے مراعات یافتہ طبقہ کے استعماری حربوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ بورژوا طبقہ، جس کا بنیادی مقصد ہی مادّی آسایشوں سے حظ کشید کرنا اور اپنی انفرادی عشرت کا سامان کرنا ہے اور ایک ایسے سماج اور کلچر کو پروان چڑھانا ہے جو حاشیے پر موجود انسانوں کو کیپیٹل ازم اور صارفی کلچر کا پُرزہ بنانے پر استقرار کرتا ہے اور ایک ایسے کلچر کو فروغ دینے کی بات کرتا ہے جو پرولتاریہ کو تاریکی میں لے جانے کا سامان کرے، پروفیسر ممتاز حسین نے ایسے بورژواژی عناصر کو اپنے تنقیدی تجزیوں کی وساطت سے اُجاگر کیا ہے تو دوسری طرف غیر مراعات یافتہ، حاشیے پر موجود مفلوک الحال، مصائب و مسائل کے مارے ہوئے انسانوں کی محرومیوں اور مجبوریوں کے خدوخال کا تجزیہ تخلیقی ادبیات کے توسط سے کرکے حاشیے پر رکھے گئے انسانوں کو اُن کے حقوق سے متعلق آگہی عطا کرنے کا فریضہ بھی سر انجام دینے کی کام یاب سعی کی ہے۔مزید یہ پروفیسر ممتاز حسین تجرباتی علم کی نفی کرنے والے تمام نظریات کو رجعتی عناصر سے تعبیر کرتے ہیں۔وہ نظریاتی تصورات، تخلیق اور حسی علم کو سماج اور کلچر کی حرکیات کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں، ادب کے ضمن میں پروفیسر ممتاز حسین تخلیقی ادب کو باقی علوم و فنون پر اُسی طرح ترجیح دیتے ہیں جیسے ارسطو نے تخلیقی فنون کو دیگر علوم و فنون پر مقدم تصور کیا ہے، تخلیقی علوم و فنون میں تخیل کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے جب کہ سائنسی علوم حقائق کو پیش کرنے کے فرائض کی بجا آوری کا کام بجا لاتے ہیں۔اُن کے نزدیک ترقی پسند ادب درحقیقت ترقی پسند آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ہی اپنی عمارت استوار کرتا ہے اور سماج میں مساویانہ اقدار کے حامل تصورات کے کلچر کے فروغ کے لیے اپنے منصب سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ترقی پسند آئیڈیالوجی کی بھی اپنی اقدار ہیں جو برابری کے کلچر کو ترویج دینے کے ساتھ ساتھ طمانیتِ قلب، روح اور وجدان کی تسکین کے عناصر سے عبارت ہیں۔اعلیٰ انسانی ثقافتی اقدار پہلے سے بہتر سماج کی نہ صرف تشکیل ہوتی ہے بلکہ انھی تصورات سے انسانی سماج ترفع سے بھی ہم کنار ہو سکتا ہے۔ایک ایسا سماج جس کی بنیادوں میں دولت کی مساوی تقسیم، مساواتِ انسانی اور انصاف پر مبنی کلچر کی ترجمانی ہو، پروفیسر ممتاز حسین ایسے سماج کو آئیڈئل تصور کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اقدار کے حامل ادب اور اُس ادب کی ترقی پسندانہ تفہیم و تعبیر کے قائل ناقد ہیں۔وہ سماج میں جاریہ صورتِ حال کے جمود کے تسلسل اور استقرار پر یقین رکھنے کی آئیڈیالوجی کے قائل نہیں ہیں۔یہی وجہ کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیتے ہیں جو عدل و انصاف کے حامل معاشرے اور کلچر کا نمایندہ و ترجمان ہو۔اِس طرح ترقی پسند ادب رجعت پسندی کے برعکس تبدیلی، حرکیات اور ترقی کا آرزو مند ہے اور ایک ایسے معاشرے کو استوار کرنے پر یقین رکھتا ہے، جہاں طبقات اور طبقاتی نظام نہ ہو بلکہ اقتصادیاتی اعتبار سے دنیا کے تمام وسائل کی تقسیم مساوات کی بنیاد پر ہو۔ ایک ایسا سماج جس کی ترقی میں مادی وسائل اور صورتِ حال کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ انسان ذہنی فرحت و انبساط سے بھی متمول ہوں۔ اس طرح ترقی پسند نظریات میں طمانیتِ قلب کی قدروں کی آئیڈیالوجی بھی اپنا فریضہ سر انجام دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔پروفیسر ممتاز حسین سرمایہ دارانہ معاشرے کی بالادستی اور ادب و انتقاد کے مسرت پرستی کے تصور پر بھی کاری ضرب لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ’سُپر سٹرکچر‘‘ کی بقا اور استحکام کے برعکس حاشیائی طبقے کی زندگی میں پہلے سے بہتری اور اُس کی ترقی کے

خواہاں ہیں۔وہ مقتدر طبقے کی جاریہ صورتِ حال اور اُس کے جکڑ بند یوں کو توڑنے پر بھی توجہ دینے والے تنقیدی افکار کو اپنے تنقیدی و فکری نظام میں مرکزی حیثیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔اُن کے تنقیدی نظریے کے اعتبار سے سرمایہ دار اور جاگیردار ایک ایسے نظام کی بُنت پر یقین رکھتے ہیں، جہاں جاریہ صورتِ حال کا انجماد برقرار رہنے پائے۔وہ ترقی پسند تخلیق کار وں اور نقاد وں سے ایسے ادب کی تخلیق کی اُمّید رکھتے ہیں جو طبقاتی نظام پر ایقان نہ رکھتا ہوجو مساوات،ذرایع پیداوار پر یکساں حقوق اور عدل پر مبنی معاشرے کے شعور کو فروغ دینے پر ایقان رکھتا ہو۔وہ ادب اور ترقی پسندانہ خیالات کے ذریعے سماج میں حقیقی تبدیلی اور انسانی ترقی کے آرزو مند ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق پر توجہ صرف کرتے ہیں جو عام آدمی کی زندگی میں پہلے سے بہتری لانے والے شعور و آگہی کی طرف رہنمائی کرنے کا موجب ہو اور جوہری نوعیت کی تبدیلی جو انسانی رشتوں کے درمیان استحصال اور استحصالی صورتِ حال کو توڑنے والی ہو۔اِس ضمن میں پروفیسر ممتاز حسین اپنی تصنیف"نئی قدریں"میں لکھتے ہیں:

> "ترقی پسند ادب طبقاتی مراعات کا نظریاتی مخالف ہے، وہ ایسی تبدیلی اور ترقی کا خواہاں ہے جو ان مراعات کو ختم کرنے والی ہو۔ یہ چوں کہ انسان دوست ادب ہے، یہ ایسی تبدیلی اور ترقی کا حامی ہے جو انسان اور انسان کے درمیان استحصالی رشتوں کو ختم کرنے والی ہو، ان کو مستحکم کرنے والی نہیں۔ آج کی سرمایہ دارانہ کثیر الاقوام کمپنیاں بھی ترقی اور تبدیلی لاتی ہیں، لیکن ایسی ترقی اور تبدیلی جو انسان اور انسان کے درمیان استحصالی رشتوں کو مضبوط اور مستحکم کرنے والی ہو۔"(21)

ترقی پسند ادب اور تنقید ایسی ترقی اور تبدیلی کو لایقِ تحسین نہیں گردانتے جو طبقاتی نظام مستحکم کرے۔ ترقی پسند ادب اور تنقید کی نظریاتی بنیادیں انسانیت کی اُس ترقی اور تبدیلی پر اُستوار ہیں جس میں حاشیائی طبقے کے لیے طمانیتِ قلب کا سامان ہو، اس کے لیے بے چینی و اضطراب نہ ہو۔ ترقی پسند آئیڈیالوجی انسان دوست معاشرے اور کلچر کی ترویج و فروغ پر کامل تیقن رکھتی ہے۔پروفیسر ممتاز حسین نے ترقی پسند تنقید کو نئے منطقوں سے مالا مال کرکے پرولتاریہ کے شعور کو ترفع سے ہم کنار کرنے کے ساتھ ساتھ بورژوا نظامِ فکر اور ہر اُس نظام پر جو اجتماعی فلاحی رویوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے، اُس کو انسانی اقدا و روایات کے برعکس قرار دیتے ہیں۔ وہ اُن تمام نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں جو مقتدرہ کو مستحکم کرتے ہیں اور طبقاتی نظام کو قائم رکھنے کی مستحکم فکر پر یقین رکھتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ممتاز حسین،پروفیسر،نقدِ حرف، کراچی، مکتبہ اُسلوب،1985ء، ص117

2. Marx, K. Capital: Volume-I. London: Penguin, 1991. P.593

اصل متن ملاحظہ ہو:

"Necessity is blind until it becomes conscious. Freedom is the consciousness of necessity. The need of a constantly expanding market for its products chases the bourgeoisie over the whole surface of the globe. It must nestle everywhere, settle everywhere, and establish connections everywhere".

۳۔ ممتاز حسین،پروفیسر،نقدِ حیات الٰہ آباد،الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس،1950ء،ص19

۴۔ احتشام حسین،پروفیسر،ذوقِ ادب اور شعور،لکھنو،ادارہ فروغِ اُردو1963ء،ص23-24

5- شمیم حنفی، ڈاکٹر، اُردو کا تہذیبی تناظر اور معاصر تہذیبی صورت حال، لاہور، شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، 2010ء،ص9

6. Guerin, Wilfred L. et al. A Handbook of Critical approaches to Literature. Oxford: OUP, 1999, P.276

اصل متن ملاحظہ ہو:

"Cultural studies are composed of elements of Marxism, new historicism, feminism, gender studies, anthropology, studies of race and ethnicity, film theory, sociology, urban studies, public policy studies, popular culture studies, and postcolonial studies: those fields that focus on social and cultural forces that either creates community or cause division and alienation".

7- ممتاز حسین،پروفیسر،نقدِ حیات الٰہ آباد،الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس،1950ء،ص21

8- ایضاً،ص۲۲

9- ایضاً،ص۲۳

10- ایضاً،ص۲۵

11- ایضاً،ص۲۶

12. Eagleton, Terry. Why Marx Was Right. London: Yale University Press, 2011. P.104

اصل متن ملاحظہ ہو:

"Genuine equality means not treating everyone the same, but attending equally to everyone's different needs".

13- ممتاز حسین،پروفیسر،نقدِ حیات الٰہ آباد،الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس،1950ء،ص29

14- ایضاً،ص31

15- ایضاً،ص33

16- ایضاً،ص34

17- نیر، ناصر عباس، ڈاکٹر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2017ء،ص27

18- ممتاز حسین،ادبی مسائل،لاہور،مکتبہ جدید،1955ء،ص67

19- ممتاز حسین،پروفیسر،نئی قدریں،لاہور،اُردو اکیڈمی،1953ء،ص170

20- ممتاز حسین،پروفیسر، حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ، کراچی،سعد پبلی کیشنز،1988ء،ص218

21- ممتاز حسین،پروفیسر،نئی قدریں،لاہور،اُردو اکیڈمی،1953ء،ص171